سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک عربی تصنیف

"ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین"

کا علمی اور فکری جائزہ

☆ پروفیسر حافظ زاہد علی، لاہور

حضرت مولانا ابوالحسن علیؒ نہ صرف اردو کے، بلکہ عربی کے بھی ایک بہت بڑے ادیب تھے اور آپ نے عربی زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں جیسے "الارکان الاربعہ، الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ و الفکرۃ الغربیۃ، الطریق الیٰ المدینہ، نحوالتربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ وغیرہ لیکن ان تمام تصانیف میں سے سب سے اعلیٰ اور بہترین تصنیف "ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین" کو تصور کیا گیا ہے۔ اور یہ کتاب نہ صرف مولانا علیؒ کی کتابوں میں سے سب سے بہترین ہے، بلکہ "اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں، جو میری نظر سے گذری ہیں ان میں شامل ہے، مولانا نے ۱۹۴۴ء میں یہ کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا اور پھر کئی سالوں کے مطالعہ کے بعد یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ کتاب کے آغاز کے وقت آپ کی عمر قریباً تیس سال تھی۔ اس موضوع پر تصنیف اس کتاب کے لئے بالغ نظری، ذہن ونظر کی پختگی، مطالعے کی وسعت اور کہنہ مشق اور تجربہ کار قلم کی ضرورت تھی، بقول مولانا علی میاںؒ ان جیسے آدمی کے لیے اس موضوع پر لکھنا "ادائے قلندرانہ" سے کم نہ تھا، لیکن انسانی کوششوں اور کاوشوں کو جب توفیق الٰہی میسر آجائے تو راستہ آسان اور منزل قریب ہوجاتی ہے۔ پھر اردو کے بجائے عربی میں، جو کہ مولانا کی مادری زبان نہ تھی، کتاب لکھنا اور بھی مشکل تھا، مولانا فرماتے ہیں:

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگ عظیم کے نتیجہ میں مصر سے نیا لٹریچر آنا بند تھا اور وہاں کی تازہ مطبوعات اور مشاہیر ادباء اور مصنفین کی نئی کتابیں نہیں آرہی تھیں۔ میرے پاس بھی کتابوں کا

☆ استاد عربی، گورنمنٹ ڈگری کالج، شیخوپورہ

محدود ذخیرہ تھا جو زیادہ تر ادب و تاریخ کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ اس وقت تک میں بہت سی نئی علمی اصطلاحات و تعبیرات سے نا آشنا تھا، اور ان کے معلوم کرنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔''

یہ کتاب اردو زبان میں لکھی جانی چاہیے تھی کیونکہ مصنف کا تعلق ہندوستان سے تھا، لیکن انہوں نے عربی کو کیوں ترجیح دی؟ مصنف لکھتے ہیں!''عربی زبان کی ترجیح وانتخاب کا محرک و باعث یہ احساس تھا کہ عرب ممالک اس احساس کمتری اور مرض خود فراموشی کا سب سے زیادہ شکار ہیں۔ دنیا نے اگر چہ نئی زندگی اور نیا ایمان پایا ہے، لیکن آج کی عرب فضا سب سے زیادہ خاموش اور انہی کا سمندر سب سے زیادہ پرسکون ہے۔ اقبالؒ نے آج سے چند برس پہلے ان ملکوں کو دیکھ کر بے جا نہیں کہا تھا:

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذان میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ سیماب
وہ سجدہ روح زمین جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

عرب کے مخصوص سیاسی حالات اور ان دیوانوں کی کمی سے جو خوش قسمتی سے ہندوستان کی سرزمین میں برابر پیدا ہوتے رہے، اور عرب کی مقدس سرزمین عرصہ سے ان کے وجود سے محروم تھی، عرب کو یورپ کی شیشہ گری اور فرزانگی کا آسانی سے شکار بن جانے دیا۔ شیخ حسن البناء مرحوم اور ان کی تحریک اور جماعت الاخوان المسلمون سے پہلے پورے مشرق اوسط میں کوئی طاقتور اسلامی تحریک اور جدوجہد نہ تھی اور کہیں بے چینی اور اولوالعزمی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ان کے ماضی و حال کا موازنہ کرنے والا بڑے درد و حسرت سے کہہ رہا تھا:

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہیں تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

مولانا علی میاںؒ اس بارے میں مزید لکھتے ہیں!

''اس تکلیف دہ احساس نے قلم کا رخ اردو سے عربی کی طرف موڑ دیا۔ عرب اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیہ کے اعتبار سے اس کے اہل ہیں کہ بین الاقوامی سیادت سنبھالیں اور پوری متمدن دنیا

پر اثر ڈالیں۔ ان کے ممالک بحر احمر اور بحر متوسط کے کنارے واقع ہیں۔ وہ مغرب اور مشرق بعید کے درمیان میں ہیں۔ نئے عالمگیر انقلاب اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے عرب ممالک اور مشرق اوسط سے زیادہ موزوں سرزمین کوئی اور نہیں ہوسکتی۔ یہ سب اسباب ومحرکات تھے جن کی بنا پر ایک ہندی نژاد مصنف نے عربی زبان کو اس اہم موضوع کے لیے انتخاب کیا اور یہ کتاب سب سے پہلے عربی زبان میں لکھی گئی جس کا نام ''ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین'' تھا۔

(مقدمہ کتاب ص ۱۷۔۱۸)

مصنف نے کتاب کے لئے جو موضوع منتخب کیا تھا، اس کے لئے وسیع مطالعہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جب مطالعہ شروع کیا تو پتہ چلا کہ عالمی جاہلیت پر کسی کتاب میں اکھٹا مواد موجود نہیں، بلکہ یہ علیحدہ علیحدہ ملکوں کی تاریخوں کی بیسیوں کتابوں، ہزاروں صفحات اور کئی زبانوں میں منتشر اور بکھرا ہوا ہے اور اکثر غیر متعلق اور ضمنی مباحث اور ان موضوعات کے ماتحت ہے جہاں مشکل سے کسی تحقیقی کام کرنے والے کی نظر جاسکتی ہے۔ مولانا علی میاںؒ فرماتے ہیں:

''مجھے اس سلسلہ میں ایک نئے سفر کا آغاز کرنا پڑا جس کی منزلیں پہلے معلوم اور متعین نہیں تھیں، لیکن توفیق الٰہی سے (جس کا اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں بار بار اور حیرت انگیز تجربہ ہوا) وہ کڑیاں ملتی چلی گئیں جن کی ضرورت تھی، لیکن یہ کام چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے جمع کرنے اور ان کا انبار لگانے کے مترادف تھا۔ اس سلسلہ میں امیر الدولہ لائبریری، لکھنؤ کے انگریزی ذخیرہ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ذاتی کتب خانہ کی اردو مطبوعات سے (جن میں سے بہت سی ''صدق'' میں تبصرہ کے لیے آئی تھیں اور بہت سی انہوں نے انگریزی تفسیر کے لئے جمع کی تھیں) اور سب سے بڑھ کر حاجی عبدالوہاب صاحب دہلوی مرحوم کے منتخب کتب خانہ کی جدید ترین عربی مطبوعات سے مدد لی، جس سے استفادہ کا موقع ۱۹۴۷ء میں مکہ معظمہ کے طویل قیام کے دوران ملا۔ ''العصر الجاہلی'' کے تحت میرے اندازہ کے مطابق اتنا مواد جمع ہوگیا جو اس وقت تک کسی کتاب میں یکجا دیکھنے میں نہیں آیا تھا''

(کاروان زندگی جلد ا ص ۲۵۹۔۲۶۰)

اس کتاب کے مقدمہ میں بھی مولانا علی میاںؒ نے لکھا ہے:

''اسی عرصہ میں (۱۹۴۷ء میں) حجاز کا پہلا سفر پیش آیا۔ وہاں پہلی بار مصنف کو اس ملک اور اہل ملک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جن کے لیے یہ کتاب تصنیف کی گئی تھی۔ حجاز کے قیام اور عالم عربی کے لوگوں سے تعارف نے اس خیال کو اور تقویت پہنچائی اور اس کتاب کے جلد از جلد شائع ہونے کی ضرورت کا احساس بشدت پیدا ہوا۔ مکہ معظّمہ کے دوران قیام میں مصنف کو محسوس ہوا کہ کتاب کا پہلا باب بہت تشنہ ہے۔ ضرورت ہے کہ جاہلیت کے خدوخال کو پوری وضاحت سے پیش کیا جائے اور پوری تفصیل سے دکھایا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی اور وہ کیا دینی واخلاقی، اجتماعی، سیاسی وثقافتی ماحول تھا جس میں اسلام کی دعوت نمودار ہوئی۔ اسلامی انقلاب کی عظمت اور اس کا محیرالعقول کارنامہ اس وقت تک ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ جاہلیت کا پورا ماحول اور اس کا نقشہ سامنے نہ ہو۔ اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ جاہلیت کا پورا نقشہ پیش کیا جائے، مکہ معظّمہ میں مصنف کو قدیم وجدید عربی مطبوعات کا ایسا ذخیرہ ملا جس سے اس مرقع کی تیاری میں بڑی مدد ملی۔ ہندوستان میں بھی مطالعہ وتحقیق کا سلسلہ جاری رہا اور یہ باب تکمیل کو پہنچ کر کتاب میں شامل ہوا اور اس سے کتاب میں معتد بہ اضافہ ہوا''

اس کتاب کی تالیف کے وقت مولانا مرحوم کی توفیق الٰہی نے کس طرح دستگیری کی اس کی مثال بھی آپ نے اپنی کتاب کاروان زندگی جلد اص ۲۵۹ میں دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں میرا قیام مدینہ طیبہ میں تھا اور میں اس کتاب کی تکمیل وتحسین میں مشغول تھا، مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یورپ میں جو اخلاقی مکتب خیال اور لذتی وغیرہ قائم ہوئے، ان کی تاریخ معلوم ہو اور عربی میں ان کے لئے کیا اصطلاحات وتعبیرات استعمال کی جاتی ہیں، ان کا علم ہو۔ اس بارہ میں میرے پاس کوئی ماخذ (Source) نہیں تھا۔ میں ایک روز اپنی قیام گاہ پر آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ ایک عرب صاحب آئے تھے۔ وہ بہت دیر تک آپ کو آواز دیتے رہے۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو دروازہ کی دراز سے یہ کتاب اندر ڈال گئے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا تو استاذ جادالمولیٰ کی کتاب تاریخ واخلاق پر تھی جس میں میری وہ تمام مطلوبہ معلومات موجود تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کتاب لانے والے ایک ترک نوجوان دوست علی علوی ترکی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اس کا کیسے خیال پیدا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ میری اس کتاب پر نظر پڑی تو میرے دل میں آیا کہ شاید یہ

کتاب آپ کی دلچسپی اور کام کی ہوگی، اس لئے میں آپ کے گھر چھوڑ آیا۔

کتاب کی تیاری اور تکمیل وتذئیل کا سلسلہ جو ۴۳۔۱۹۴۴ سے شروع ہوا وہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ چنانچہ کتاب تو مکمل ہوگئی جس پر چار پانچ سال کا عرصہ لگا۔ تحریر کے دوران میں پہلے تو خیال یہ تھا کہ یہ مضمون ایک مقالہ کی شکل میں ہوگا۔ اس سے قبل جن لوگوں نے اس بارہ میں کچھ لکھا تھا اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ ''امت مسلمہ کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟'' مولانا علی میاںؒ نے محسوس کیا کہ اس کتاب کی تالیف وقت ایک نہایت اہم ضرورت ہے۔ خود مسلمانوں کا ذہن اس بارہ میں صاف نہیں۔ وہ زندگی سے اپنا کوئی رابطہ اور تعلق محسوس نہیں کرتے اور اس دنیا کی اپنے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو مسلمانوں کے زوال کو ایک قومی حادثہ اور مقامی واقعہ تصور کرتے ہیں، اور ان کو مطلقاً اس بات کا احساس نہیں کہ یہ کتنا بڑا عالمگیر واقعہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے ہم نہ اسلامی تاریخ کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی انسانی تاریخ کو، نہ اس دور کی صحیح تشخیص کر سکتے ہیں جو ابھی دنیا میں قائم ہے اور نہ اس عالمگیر انقلاب کے صحیح اسباب متعین کر سکتے ہیں جو دنیا کی تاریخ میں رونما ہوا، اور وہ اسلامی انقلاب کے بعد سب سے بڑا انقلاب ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلا انقلاب امت محمدیؐ کے انحطاط و زوال اور دعوتِ اسلامی سے تغافل کا نتیجہ ہے۔ ضروری ہے کہ مسلمان کو اس کا اپنا مقام یاد دلایا جائے اور اسے بتلایا جائے کہ وہ دنیا کی تعمیر وتشکیل کے اہم اور مقدس کام میں ایک مؤثر و فعال عنصر میں کسی چلتی ہوئی مشین کا پرزہ اور کسی اسٹیج کے ایکٹر نہیں ہیں۔

کتاب جب مکمل ہوگئی تو اب اس کی طباعت و اشاعت کا مرحلہ تھا۔ مولانا علی میاںؒ کا خیال تھا کہ یہ کتاب مصر کے کسی وقیع ادارہ کی طرف سے شائع ہو اور اس کا شایانِ شان تعارف ہو تاکہ اس کا وہ مقصد حاصل ہو جس مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، لیکن وسائل کی ناہمواری کے باعث پتہ چلا کہ کتاب کی اشاعت وطباعت میں ابھی کافی دیر لگے گی کیونکہ مولانا مرحوم کے مصر کے اشاعتی اداروں سے روابط اور تعلقات نہیں تھے اور کتاب کی طباعت کے لیے اس زمانہ میں تعلقات کو بڑا دخل تھا۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کردیا۔ بعد میں اس میں کچھ اضافہ کیا گیا اور پھر پوری کتاب کا ترجمہ مولانا محمد میاں اور مولانا عبداللہ عباس ندوی نے ''انسانی دنیا پر

مسلمانوں کے عروج زوال کا اثر'' کے نام سے شائع ہوا اور وہی ترجمہ آج تک چل رہا ہے۔ مولانا علی میاںؒ نے جو ترجمہ کیا تھا وہ اسی زمانہ میں جمال پرنٹنگ پریس دہلی، سے چھپ گیا۔ اسی زمانہ میں اس کتاب پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نظر پڑی۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس کتاب کو بڑا پسند فرمایا اور آپ نے اپنی کتاب ''نقش حیات'' میں اس کے کچھ اقتباسات بھی نقل فرمائے ہیں۔ ان دونوں حضرات کا اس کتاب کی تحسین تعریف فرمانا مولانا علی میاںؒ کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

''اس وقت تک مصنف کو خود اس کا اندازہ نہ تھا کہ یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرتی ہے اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ذہنی حرکت پیدا کرسکتی ہے، لیکن اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ کتاب کو ضرور منظر عام پر آنا چاہیے۔ (کاروانِ زندگی، جلد ا، ص ۳۶۴)

مصنف کا سفرِ حجاز

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۴۷ء میں مولانا علی میاںؒ کو حجاز کا پہلا سفر پیش آیا۔ اس وقت حرم مکی کے امام اور خطیب ایک مصری عالم فضیلۃ الشیخ محمد عبدالرزاق حمزہ تھے۔ شیخ ایک نہایت جید اور وسیع النظر عالم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں متنوع الکمالات بنایا تھا۔ جدید مطبوعات اور مختلف علوم پر ان کی نظر وسیع و عمیق تھی اور اپنی دینی و خطابتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مختلف علوم کی کتابوں کے مطالعہ میں ہر وقت منہمک رہتے تھے۔ مولانا علی میاںؒ کا ان سے رابطہ ہوا اور ان کی خدمت میں اس کتاب کا مسودہ پیش کیا۔ شیخ کو چونکہ مطالعہ کا شوق تھا، اس لیے انہوں نے اس مسودہ کا بغور مطالعہ کیا اور انہوں نے نہایت بلند الفاظ میں کتاب کے بارے میں اپنے تأثرات ظاہر کیے اور مولانا علی میاںؒ کو تاکید کی کہ وہ اس کتاب کو جلد از جلد طبع کرائیں۔ یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے۔

شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ کے تاثرات نے مولانا علی میاںؒ کی ہمت بندھائی اور انہیں حوصلہ دیا۔ چنانچہ ایک روز وہ مکہ مکرمہ کے واحد تجارتی مطبع ''مطبعۃ الکردی'' تشریف لے گئے اور کتاب کی طباعت کا تخمینہ (Estimate) لگوایا۔ تخمینہ کیا لگا؟ مولانا علی میاںؒ نے اس کا ذکر تو نہیں کیا۔ البتہ اس زمانہ میں وہ افریقہ سے مکہ مکرمہ آئے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی صاحب علم و نظر تھے اور مخیّر و فیاض

بھی تھے۔ مولانا مرحوم ایک روز دل بڑا کر کے ہوٹل لوکانده میں ان سے ملے۔ کتاب کا تعارف کرایا اور اس کی طباعت کی ضرورت ظاہر کی۔ تو نہایت ذی علم او رصاحب نظر کی معمولی رقم مولانا علی میاںؒ کو عنایت فرمائی۔ مولاناؒ نے دل شکستہ ہوکر اس رقم کو قبول کرلیا۔ اس کے بعد مولانا مرحومؒ فرماتے ہیں!

''جہاں ہم لوگوں کا قیام تھا اس کا راستہ حرم شریف سے ہوکر بھی جاتا تھا میرا وضو تھا۔ میں سیدھا حرم شریف گیا اور اسی دل شکستگی کے عالم میں ملتزم پر اس کتاب کی طباعت کے سامان ہونے اور قبولیت کی دعا کی۔ غالباً اس دعا ہی کا اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس طباعت کا غیب سے بہتر سے بہتر سامان پیدا کیا اور اس کو وہ مقبولیت عطا کی جو میری کسی تصنیف کو حاصل نہیں ہوئی۔''

اس دعا کی مقبولیت کا اثر یہ بھی ہوا، مولانا علی میاںؒ ہی کا بیان ہے:

''اس کا ہلکا سا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس وقت تک کتاب کے پندرہ کے قریب صرف قانونی ایڈیشن مصر، بیروت اور شام سے نکل چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن ۱۹۸۲ء میں ایک لاکھ کی تعداد میں دارالعلم کویت سے نکالا گیا جس کے اسی (۸۰) ہزار نسخے مکتبۃ الحرام ریاض نے لیے اور بقیہ بھی اس وقت تک نکل چکے ہوں گے۔ کتاب کے اردو میں نو اور انگریزی میں چھ ایڈیشن، ترکی و فارسی میں کم سے کم دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔'' (کاروانِ زندگی جلد اص ۲۶۵، حاشیہ)

یہ سنہ ۱۹۸۳ء کی بات ہے، اس کے بعد اس کتاب کے کتنے ایڈیشن نکلے، خدا ہی جانتا ہے۔ مختصر یہ کہ کتاب مولانا علی میاںؒ کی قبولیت دعا کی وجہ سے اس قدر مقبول ہوئی کہ مولانا مرحوم کی کوئی اور کتاب اتنی نہیں چھپی۔

مولانا مرحوم کی یہ دلی خواہش تھی کہ ان کی یہ کتاب مصر میں کسی وقیع اور اچھے ادارہ کی طرف سے شائع ہو اور اس کا شایانِ شان تعارف ہوتا کہ مولانا مرحوم کا دلی مقصد حاصل ہو۔ چنانچہ آپ کی نظر انتخاب مصر کے مشہور ادیب اور مؤرخ ڈاکٹر احمد امین (سابق پرنسپل کلیۃ الادب، جامعہ مصریہ) پر پڑی جن کی خود اپنی دو کتابیں ''فجر الاسلام'' اور ''ضحیٰ الاسلام'' عالمگیر شہرت حاصل کرچکی ہیں۔ مولانا مرحوم پر ان کی سلامت فکر، دقت نظر اور اصابت رائے کا نہایت اچھا اثر تھا۔ ڈاکٹر احمد امین کے اشاعتی اور تصنیفی مرکز ''لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر'' قاہرہ کی بڑی شہرت تھی۔ اس ادارہ

سے کسی کتاب کا شائع ہو جانا اس کی وقعت اور قدر و قیمت کو بڑھاتا اور علمی حلقہ میں اس کا اعتماد پیدا کرتا تھا۔ مولانا مرحوم نے ان سے مراسلت شروع کی اور اس کتاب کے مضامین کی فہرست ارسال کی۔ انہوں نے اپنے ایک خط کے ذریعہ پتہ چلانا چاہا کہ مصنف نے اجنبی مصادر سے کہاں تک استفادہ کیا ہے، اور یہ کتاب صرف مولویانہ اور داعیانہ ہے یا مؤرخانہ اور محققانہ؟ مولانا مرحوم نے کتاب کی انگریزی فہرست اور اس کے مسودہ کی ایک نقل بھیج دی۔ ڈاکٹر احمد امین نے بڑی گرم جوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور کتاب کو زبان اور مواد دونوں کے لحاظ سے مکمل اور نہایت عمدہ قرار دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا مرحوم کی خواہش کے مطابق کتاب کا مقدمہ لکھ کر کمیٹی سے اس کتاب کی اشاعت کی پر زور سفارش کی۔ کمیٹی نے اس کی طباعت کا فیصلہ کرلیا اور مولانا مرحوم کو اس کی اطلاع بھجوادی گئی۔ مولانا کو خط پڑھ کر نہایت مسرت ہوئی اور ہونی بھی چاہیے تھی، کیونکہ اس کتاب کی اشاعت نے آپ کے دعوتی کاموں میں آسانی پیدا کردی اور مشرق وسطیٰ کے علمی اور دینی حلقہ میں ان کا تعارف کروادیا۔ چنانچہ مولانا مرحوم خود فرماتے ہیں کہ ''میں جب سنہ ۱۹۵۱ء میں مصر گیا تو یہ کتاب وہاں کے علمی و دینی حلقوں میں خوب پھیل چکی تھی، اور میرے تعارف کے لئے اتنا کافی سمجھا جاتا تھا کہ یہ'' **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین** '' کے مصنف ہیں۔ (کاروان زندگی جلد اص ۲۶۶)

مصر میں یہ کتاب سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی، لیکن مصنف کتاب کو سنہ ۱۹۵۱ء تک اس کے دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ حالانکہ جس مطبع نے کتاب طبع کی تھی ان کا فرض تھا کہ اس کے کچھ نسخے مصنف کو بھی بھیجا۔ آپ اس کو بے پروائی سے تعبیر کریں یا پھر غفلت اور بدانتظامی سے کہ پورا ایک سال مصنف اپنی طبع شدہ کتاب کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا۔ اور مولاناؒ کو کیسے پتہ چلا کہ ان کی کتاب مصر میں ''**بحنة التالیف و الترجمه و النشر**'' کی طرف سے شائع ہو چکی ہے، اس کا بھی ایک دل چسپ واقعہ ہے جو خود مولانا مرحوم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

''میں نے جنوری سنہ ۱۹۵۱ء کی ابتدائی تاریخوں میں جب مکہ معظمہ میں میرا طویل قیام رہ چکا تھا، مصر کے سفر کا عزم کیا تو شام کو بھی اس پروگرام میں شامل کرنے کا ارادہ ہوا۔ میں شامی سفارت خانہ جدہ میں شام کا ویزہ لینے گیا۔ عزیزان مولوی معین اللہ ندوی (حال نائب ناظم ندوۃ العلماء) اور مولوی عبدالرشید ندوی جو سال ڈیڑھ سال سے دعوت و تبلیغ اور میرے دعوتی رسائل کو اہل

علم تک پہنچانے کے لیے مکہ میں مقیم تھے، اس سفر میں میرے ساتھ جانے والے تھے، میرے ساتھ سفارت خانہ گئے۔

''جب شام کا ویزہ مل گیا تو میں نے سفیر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حسن اتفاق سے اس وقت اس عہدہ پر استاذ جواد المرابط متعین تھے جو خود فاضل وادیب تھے اور المجمع العربی، دمشق کے رکن تھے، انہوں نے ہم لوگوں کو اوپر بلالیا۔ ادبائے مصر اور وہاں کے اہل قلم پر بات نکلی تو انہوں نے کہا کہ ہندوستانی علماء و مصنفین کی تحریر میں ہم کو جو اثر اور دل آویزی محسوس ہوتی ہے، وہ ان کے یہاں نہیں پائی جاتی، مثلاً میں ابھی مصر گیا تھا۔ وہاں ایک مکتبہ میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' میں لے آیا اور پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ میرے اندر یہ سن کر ایک بجلی سی دوڑ گئی اور میں نے بڑے اشتیاق و اضطراب کے ساتھ پوچھا! ''کیا یہ کتاب آپ کے پاس ہے؟ اور ہمیں دکھا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا: ''ہاں'' اور الماری سے کتاب نکال کر دی۔ میں نے چند دن کے لیے اس کو ان سے مستعار لے لیا۔ اپنی کتاب پڑھ کر ایک مصنف کو جو خوشی ہونی چاہیے وہ قدرتاً مجھے ہوئی، لیکن ڈاکٹر احمد امین کا مقدمہ پڑھ کر دل پھیکا ہو گیا اور فرمائشی معلوم ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر کتاب کی انہوں نے تعریف کی تھی اور اس کے مقصد سے اتفاق کیا تھا۔''

(کاروان زندگی، جلد ا، ص ۲۶۷۔ ۲۶۸)

یہ مقدمہ صرف مصنف کے نزدیک ہی پھیکا نہ تھا، بلکہ اکثر قارئین نے بھی اسی تاثر کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ والی شرق اردن شاہ عبداللہ بن شریف حسین کو ایک ملاقات میں جب مولانا مرحوم نے یہ کتاب پیش کی تو انہوں نے بھی پڑھ کر اسی تاثر کا اظہار کیا اور ڈاکٹر احمد امین کے مقدمہ کو پسند نہ کیا اور بھی کئی دوستوں نے برملا کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ میں کتاب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ انہوں نے مقدمہ میں کتاب کی بڑی تعریف کی، لیکن ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ ''اگر قارئین کو کتاب میں کہیں غموض نظر آئے تو ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مصنف بہر حال ہندی نژاد شخص ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا مقدمہ لکھنے کا ارادہ کیا تو یا تو وہ لکھنے کے موڈ میں نہ تھے یا پھر ان کو یہ خیال ہوا کہ ایک ایسے گم نام اور نوعمر مصنف کے حق میں ان کو زیادہ تحقیق و تعریف کا اظہار نہیں کرنا چاہیے جسے انہوں نے ابھی دیکھا بھی نہیں، اور معلوم نہیں کہ وہ اپنے حلقہ میں کس

نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

دوسری بات اس بارہ میں یہ ہے کہ مولانا علی میاںؒ کو اس بات کا خود اعتراف ہے کہ آپ نے ”مقدمہ نگار“ کے انتخاب میں غلطی کی۔ کسی کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لیے مقدمہ نگار کا سلیم الفکر، دقیق النظر اور وسیع المطالعہ ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ مقدمہ نگار کو کتاب کے موضوع سے ہمدردی اور اس کے نتائج بحث سے پورا پورا اتفاق ہو اور اس کی کامیابی کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خواہش مند ہو۔ ڈاکٹر احمد امین میں اس بات کی کمی تھی۔ وہ صرف مصنف، مفکر اور ایک کامیاب مورخ ہیں۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اس کی عالمی قیادت کے بارہ میں وہ کچھ زیادہ پرامید نہیں۔ گویا ان کو اس کتاب کی اصل روح سے کوئی خاص مناسبت نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا کتاب پر لکھا ہوا مقدمہ روح اور تاثیر سے خالی اور ایک ضابطہ کی خانہ پری تھی۔ چنانچہ مصر، شام، فلسطین اور حجاز وغیرہ میں ہر جگہ یہ محسوس کیا گیا کہ مقدمہ نے کتاب کی قدر و قیمت اور اس کی ادبی اور تاریخی وقعت میں اضافہ کرنے کے بجائے اس کی روح کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا ہے اور کتاب کے وزن کو ہلکا کر دیا ہے لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس پھیکے اور ہلکے مقدمہ کے باوجود ”لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر“ کی طرف سے کتاب کا شائع ہو جانا کتاب کی شہرت کے لیے نہایت مفید ہوا، اور کتاب ان حلقوں میں بھی پہنچ گئی جہاں خالص دینی کتابیں اور اسلامی دعوت کے سلسلہ کی چیزیں آسانی سے بار نہیں پاتیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۱ء میں جب مولانا علی میاںؒ شرق اوسط تشریف لے گئے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ کتاب ان حلقوں میں بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھی گئی تھی اور بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال ہوا تھا۔ کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اسلامی فکر کے حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ مصر میں الاخوان المسلمون کے ذمہ دار حضرات نے اس کو اپنے تعلیمی اور تربیتی سلسلہ میں شامل کیا تھا اور مطالعہ اور تربیت کے حلقوں سے لے کر جیل خانوں تک اس کی اشاعت اور تشہیر ہوئی۔ عدالت کی بحثوں اور پالیمنٹ کی بحثوں اور تقریروں تک میں اس سے استفادہ کیا گیا۔ مختصر یہ کہ جدید اور قدیم دونوں حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی جو کہ مولانا علی میاںؒ کے لیے سرمایہ سعادت اور موجب تشکر بنی۔

جب کوئی شخص اخلاص سے کام کرے تو غیب سے اس کی مدد اور دستگیری کے سامان مہیا

ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر احمد امین کے لکھے ہوئے مقدمہ کی کمزوری اور پھیکا پن کی تلافی کا اللہ تعالیٰ نے غیب سے سامان مہیا کردیا۔ وہ اس طرح کہ ڈاکٹر احمد امین کے ایک عزیز شاگرد ڈاکٹر شکری فیصل نے، جوان کی ماتحتی میں ریسرچ کا کام کررہے تھے، کتاب کے تعارف اور تبصرہ پر ایک نہایت طاقتور مضمون لکھا اور ڈاکٹر احمد امین کے رسالہ ''مجلة الثقافة'' میں شائع کرایا، جس میں انہوں نے کتاب مواد، مضامین اور زبان واسلوب کی بھی تحسین وتعریف کی اور ڈاکٹر صاحب کے اس فقرہ پر نہایت استعجاب اور حیرت کا اظہار فرمایا جو انہوں نے کتاب کی بعض عبارتوں اور تعبیرات کے غیر واضح ہونے پر لکھا تھا۔ پھر استاذ مصطفیٰ العطاء نے جو بعد میں ایک بڑے تعلیمی عہدہ پر فائز ہوئے، کتاب کی تائید میں ایک مستقل مضمون لکھا جو وہاں کے ایک اخبار میں شائع ہوا اور عرب احباب نے نہایت دل چسپی اور شوق سے پڑھا۔

مصر کے قیام کے دوران ہی میں کتاب کی دوسری اشاعت کی نوبت آگئی۔ اس موقع پر حضرت مولانا علی میاںؒ کے ایک مخلص دوست اور کتاب کے ایک بہت بڑے قدر دان ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ سابق استاذ جامعہ ازھر نے اپنے ایک ادارے ''جماعة الازهر للنشر والتاليف'' کی طرف سے طبع ثانی کی پیش کش کی اور حضرت مولانا علی میاںؒ کے ایماء سے ڈاکٹر احمد امین سے اس کی طبع ثانی کی اجازت حاصل کرلی۔ مولانا مرحوم کو بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ اس مرتبہ سابقہ غلطی کی تلافی کا امکان پیدا ہوگیا۔ اب اس کا موقع تھا کہ کتاب کے مقصد اور روح کو مدنظر رکھ کر ایک پرزور مقدمہ لکھا جاتا۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں مصر کے قیام کے دوران مولانا علی میاںؒ کو معلوم ہوا کہ الاخوان المسلمون کے اہم لیڈر اور مصر کے مشہور دانشور اور ادیب سید قطب اس کتاب سے بہت متاثر ہیں، اور اس کی وجہ سے انہوں نے مولانا علی میاںؒ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا مرحوم کو جمعہ کی ایک مجلس میں جس میں اس کتاب پر مقالہ پڑھا جانے والا تھا، اور پھر اس پر بحث ہونی تھی، اپنے ہاں مدعو کیا۔ اس وقت مولانا مرحوم کو اچانک یہ خیال آیا کہ میں ان سے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھنے کی درخواست کروں۔ مولانا مرحوم کی اس درخواست کو سید قطب نے بڑی خوشی سے منظور کرلیا اور ایسا طاقتور اور مفصل مقدمہ لکھا جس نے کتاب کی قدر وقیمت میں بہت اضافہ کیا۔

انہوں نے اپنے مقدمہ میں کتاب کے مختلف ابواب پر اجمالی تبصرہ کیا اور بتایا کہ اس موضوع اور مقصد پر جو چند بہترین کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں مولانا علی میاںؒ کی اس کتاب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور یہ کتاب بڑی مربوط، مدلل اور حقیقت پسندانہ علمی اسلوب و انداز میں لکھی گئی ہے، اور اس کے دعاوی جذباتیت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ٹھوس اور ناقابل تردید دلائل پر مبنی ہیں.

سید قطب کے اس مقدمہ لکھنے سے قبل ایک مقدمہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، استاذ کلیۃ اصول الدین، ازہر یونیورسٹی، قاہرہ، لکھ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس کتاب کے خاص قدردانوں میں سے تھے۔ انہوں نے مکمل کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھ کر اس کے سرورق (ٹائٹل) پر لکھا تھا کہ

''ہر ایسے شخص کے لیے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو ترقی کا خواہش مند ہو''۔

سید قطب، مصر جدید میں اسلامی فکر اور دینی دعوت کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ وہ اخوان المسلمون کے ایک اہم لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا قلم چند برسوں سے نوجوانوں میں خود اعتمادی اور اسلامی روح پیدا کرنے کے لیے دن رات کام کر رہا تھا۔ ان کی ذات میں وسیع النظر علماء کا مطالعہ، جدید ادیبوں کا زور قلم اور اسلوب، داعی کا جذبہ و اخلاص اور نومسلموں کا جوش جمع ہے۔ ان کا مصر کے ادباء، علماء اور مغربی تہذیب کے ناقدین میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ مغربی زندگی کے تاریک پہلو قیام امریکہ کے دوران، کھلے طریقہ پر ان کی نظر کے سامنے تھے۔ مغربی تہذیب اور فلسفہ زندگی کی ناکامی کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیا تھا۔ امریکہ سے واپس آنے کے بعد وہ اسلام کے ایک پرجوش داعی اور مغربی تہذیب کے ناقد بن گئے تھے۔ ان کی فکر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک ادبی اور عالم گیر پیغام نہ صرف سمجھتے، بلکہ مانتے ہیں جس کے بغیر دنیا کی نجات اور سلامتی ممکن نہیں۔ ان کو اسلام میں کوئی کمزوری اور کمی محسوس نہیں ہوتی، اس وجہ سے وہ معذرت اور مدافعت کے قائل نہیں، بلکہ مغربی تہذیب کی بنیادوں پر تیشہ چلاتے ہیں اور حریف پر بڑھ کر حملہ کے قائل ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھنے والوں میں اعتماد و یقین کی ایک نئی روح اور مغربی نظام فکر کی حقارت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوا مقدمہ واقعی اس قدر طاقتور اور حوصلہ افزا ہے کہ قاری میں خود اعتمادی اور اسلام کے بارہ میں اسے فکر انگیز غذا ملتی ہے۔ چنانچہ سید قطب نے

مولانا مرحوم کی کتاب کے مقدمہ میں لکھا:

''پیش نظر کتاب اپنے ناظرین کے دل میں ان تمام احساسات کو ابھارتی ہے اور ان تمام حقائق کو دل میں اتارتی چلی جاتی ہے، لیکن کتاب کا اسلوب یہ نہیں کہ صرف جذبات ابھار دے یا عصبیت کا جوش پیدا کردے۔ اس میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ٹھوس علمی حقائق سے کام لیا گیا ہے جو بیک وقت وجدان وشعور اور فکر ونظر دونوں کو اپیل کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور اس عصر کے ماحول ومتعلقات ایسے منصفانہ طریقہ پر پیش کیے گئے ہیں جن میں مصنف کی روشن دماغی صاف جھلکتی ہے۔ پھر فیصلہ واقعیت وصداقت اور قلب وضمیر کی بصیرت کے سپرد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کے مباحث کی تمام کڑیاں مربوط اور ایک دوسرے سے پیوست نظر آتی ہیں اور کہیں بھی کسی مسئلہ میں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے میں غیر واقعیت یا تکلف کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ اس کتاب کی اولین خصوصیت ہے۔''

اس خصوصیت کے ذکر کے بعد سید قطب نے اس کتاب کی اور بہت سی خصوصیات ذکر کی ہیں اور بتایا ہے کہ مصنف کتاب نے کتاب کے پہلے باب میں جاہلیت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد یہ واضح کیا ہے کہ انسانیت کی تعمیر کے سلسلہ میں اسلام نے کیا کارنامہ انجام دیا اور کس طرح انسانی روح کو اوہام وخرافات سے نجات دلائی۔ ذلت وغلامی سے کس طرح گلوخلاصی کرائی، مختلف قسم کی غلاظتوں، گندگیوں، ناپاکیوں اور کمزوریوں سے کس طرح انسان کو نکالا اور کس طرح انسانی معاشرے کو ظلم وسرکشی اور انسانی تہذیب کو انتشار وتباہی سے بچایا۔ سماجی طبقہ واریت سے ملوک وسلاطین کے جور وستم سے اور پادریوں اور مہنتوں کی غلام انسانیت کو آزاد کرایا اور پھر نئی بنیادوں پر دنیا کی تعمیر کی۔ یقین ومعرفت، وثوق واعتماد، عدل وانصاف اور خودداری وخود اعتمادی عطا کی اور دنیا کو صحیح نشوونما اور متوازن ارتقاء کے لیے عمل پیہم اور سعی مسلسل پر آمادہ کیا، تاکہ زندگی کی پوشیدہ طاقتیں بروئے کار آئیں۔ یہ سب اس وقت کی بات ہے جب دنیا کی زمام کار اسلام کے ہاتھوں میں تھی اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق اور اپنے ڈھنگ سے کام کرنے کا موقع حاصل تھا اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے جوہر اسی وقت کھلتے ہیں جب قیادت کی زمام کار اس کے ہاتھ میں ہو، اس لیے کہ اسلام کا دوسرا نام سروری وجہاں بانی ہے وہ قیادت کا ایک نظام ہے وہ کسی کا دریوزہ گر نہیں،

بلکہ انسانی قافلے کا قائد اور سربراہ ہے۔

اس کتاب میں مولانا مرحوم نے دنیا کو مسلمانوں کی مبارک قیادت سے محروم ہونے اور جاہلیت اولیٰ اختیار کر لینے کے بعد دنیا پر کیا گذری؟ اس ہولناک پستی کی نشان دہی کی ہے، بدقسمتی سے اس پستی کا زمانہ وہی زمانہ ہے جس میں علم وفن کی راہیں کھلیں، صنعتی انقلاب آیا اور انسانیت نے مادی میدان میں بڑی ترقی حاصل کی۔ ایک قاری کتاب کا مطالعہ کرتے وقت جب اس کا تاریخی جائزہ لیتا ہے تو وہ بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے کہ موجودہ قیادت بدلنے کی سخت ضرورت ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انسانیت کو پھر اسی سرچشمہ ہدایت پر لاکر کھڑا کر دیا جائے جس کا مقصد انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف اور جاہلیت سے نجات دلا کر علم ومعرفت کی طرف لانا تھا۔ کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی قیادت کو کھو کر نہ صرف خود زوال پذیر ہوا، بلکہ انسانیت کو بھی بہت بڑا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ اتنا بڑا خسارہ جو ماضی، حال اور مستقبل قریب وبعید سب پر حاوی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ندامت وشرمندگی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔

ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا

یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس نے کسی مجرمانہ کوتاہی اور غفلت کا ارتکاب کیا ہے۔ دوسری طرف اس کے اندر یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ اسے کس قدر عظیم الشان صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں اور پھر اس عالمی قیادت کو جو اسے ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک حاصل رہی، حاصل کرنے کی تڑپ اور جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جو اس نے اپنی نالائقی، غفلت اور کوتاہی سے کھودی۔

اس کتاب کو پڑھ کر یہ پتہ چلتا ہے بلکہ یہ اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ یہ کتاب نہ صرف دینی و اجتماعی تحقیق علمی کا نمونہ ہے، بلکہ اسلامی نقطہ نگاہ سے تاریخ کو کس طرح مرتب کرنا چاہیے، اس کا بھی نمونہ ہے، کیونکہ مغربی مؤرخین نے دنیا کی تاریخ مغربی نقطۂ نظر سے لکھی ہے اور وہ قدرتاً اپنی مادی تربیت، مادی فلسفے اور پھر مذہبی اور قومی تعصب کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے تاریخ میں بہت سی اغلاط اور جابجا بے اعتدالیاں گھسیڑ دی ہیں، اور انسانی زندگی کی بہت سی اہم قدروں کو دانستہ طور پر فراموش کر دیا ہے، حالانکہ انسانی زندگی کی تاریخ ان کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں یورپین مؤرخ عموماً اپنی قومی و مذہبی تعصب کی وجہ سے

دنیا کا مرکز یورپ ہی کو قرار دیتے ہیں اور زندگی کے دوسرے اہم موثرات اور محرکات کو یک قلم نظر انداز کر دیتے ہیں، بدقسمتی سے ہم لوگ اس کے عادی چلے آرہے ہیں کہ ہم جس طرح مصنوعات یورپ سے درآمد (Import) کرتے ہیں اسی طرح تاریخ بھی یورپ ہی کے ہاتھوں حاصل کرتے ہیں، اور اس کو جوں کا توں لے لیتے ہیں حالانکہ ان کا طریقہ تصنیف اور طریق فکر سرے سے ناقص اور پُراز اغلاط ہے۔ اس طرح ان کے غلط مقدمات سے ہم غلط نتیجہ نکالنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

آخر میں ہم اس مضمون کو سید قطب کے اس اقتباس پر ختم کرتے ہیں جو انہوں نے مولانا علی میاںؒ کی اس کتاب سے نقل کیا ہے۔ سید قطب نے لکھا ہے کہ فاضل مولف کتاب کے آخری باب میں فرماتے ہیں:

''عالم اسلامی کا پیغام اللہ اور اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قیادت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا صلہ یہ ملے گا کہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف، انسان کی عبادت سے نجات پا کر اللہ کی عبادت کی طرف، دنیا کی تنگنائی سے نکل کر عالم کی وسعت کی طرف، مذاہب کے جور وستم سے بچ کر عدل اسلامی کی طرف آنا نصیب ہوگا۔ اس پیغام کی اہمیت سامنے آچکی ہے اور اس زمانے میں اس کا سمجھنا دوسرے زمانہ کی بہ نسبت زیادہ آسان اور سہل ہے۔ آج جاہلیت سر بازار ذلیل و رسوا ہو چکی ہے، اس کے ڈھکے چھپے عیب نگاہوں کے سامنے آگئے ہیں۔ دنیا اس سے عاجز آچکی ہے۔ لہٰذا جاہلی قیادت کو چھوڑ کر اسلامی قیادت کی طرف منتقل ہونے کا یہ خاص وقت ہے، بشرطیکہ عالم اسلامی کے لیے کھڑا ہو اور اس پیغام کو پورے عزم و اخلاص اور جرات و ہمت کے ساتھ اپنا لے اور اس پیغام کو دنیا کا نجات دہندہ باور کرے اور یقین کرے کہ پستی اور تباہی سے دنیا کو صرف یہی پیغام نجات دلا سکتا ہے۔''